مرثیۂ اقبالؒ

اسد ملتانی

جملہ حقوق محفوظ

مرثیۂ اقبالؒ

از

اسدؔ ملتانی

شائع کردہ

ادارۂ روزنامہ شمسؔ ملتان شہر

قیمت تین آنے

سرورِ رفتہ

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبالؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند الفاظ

(جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی اے)

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ بربطِ ہستی کے بہت سے خوابیدہ نغمے مضرابِ غم سے بیدار ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کی تفسیر آپ کو پیشِ نظر مرثیہ میں ملے گی۔ محترمی جناب اسدؔ ملتانی کے کلام میں ندرتِ فکر و سلاستِ بیان کے ساتھ ساتھ بلند نگاہی۔ حقائق پروری۔ شعارِ اُمید کی تابندگی اور جوشِ عمل کی حرارت کی وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اثر و درد اور سوز و گداز کے یہ المیہ جذبات فطرت نے اُنکے قلب کی گہرائیوں میں شاید اسی قیامتِ صغریٰ کے لئے چھپا کر رکھے تھے جس نے آج تمام

عالمِ اسلامی کو یوں سیاہ پوش بنا رکھا ہے۔

محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں بالعموم پردہ ہائے مجاز کی رنگینیوں میں محوِ تماشا ہو کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح وہ عروسِ حقیقت کے حُسنِ بسیط سے بہت کم بہرہ یاب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے عام طور پر حضرت علامہؒ کو ایک شاعر ہی سمجھا اور شاعری کی حیثیت سے اُن کا ماتم کیا۔ حقیقت بیں نگاہیں ڈھونڈتی تھیں کہ وہ "محرمِ راز" بھی کہیں ہے جو ان پردوں کے نقش و نگار سے گذر کر اقبال کے صحیح مقام تک پہنچ چکا ہو۔ نگاہیں اُٹھتی تھیں اور مایوس ہو کر لوٹ آتی تھیں جنابِ آسیؔ مستحقِ سپاس و امتنان ہیں کہ انہوں نے نگاہِ شوق کی حسرت کو طمانیت سے بدل دیا۔

اقبال کا مرثیہ درحقیقت عالمِ اسلامی کی بیکسی اور یتیمی کا مرثیہ ہے اور اسے وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی انگلیاں نبضِ ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہوں، جس کا دماغ حقائقِ قرآنی سے منور اور قلب دردِ ملی سے لبریز ہو۔ یہ توفیق حلقۂ اقبال ہی کے کسی رندِ سرشار کا حصہ تھی اور ظاہر ہے

کہ جنابِ اسدؔ سے بڑھکر اس سعادت کا مستحق اور کون ہو سکتا تھا!

سب سے بڑی خصوصیت جس کی وجہ سے یہ مرثیہ ایک انفرادی شان کا حامل ہو رہا ہے یہ ہے کہ اس سے اظہارِ غم سے زیادہ پردہ داریٔ غم مقصود ہے اور اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ آنکھ کے آبگینے میں جھلکتے ہوئے آنسوؤں کو پیمانۂ قلب میں لوٹا کر لے جانا اور یوں آبروئے ضبط کو پامال نہ ہونے دینا کچھ آسان کام نہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ جنابِ اسدؔ کو باوجودِ اختیار اپنے دل پر اسقدر جبر کیسے حاصل ہے!

پھر یہ چیز بھی قابلِ دید ہے کہ سحابِ غم میں سے گذرتی ہوئی شعاعِ اُمید ذہنی اُفق پر جو نمناک لیکن درخشندہ قوسِ قزح پیدا کر رہی ہے وہ مرثیہ کی دُنیا میں غالباً پہلی مثال ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ لیکن یہ مرثیہ وہ ہے جو حضرتِ علامہؒ کی بارگاہ میں اُردو شاعری کی تہی دامنی اور کم مائگی کا کفّارہ ادا کرے گا۔ اور کیوں نہ ہو۔

کہ اصلِ ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ جنابِ اسدؔ نے سب سے پہلے یہ

مرثیہ مجھے سنایا اور میرے ہی تقاضائے شوق پر انہوں نے اسے "طلوعِ اسلام" میں اشاعت کیلئے مرحمت فرما دیا۔ یہ چند الفاظ ان تاثرات کا نہایت ناکام سا ذریعۂ اظہار ہیں جو اس مرثیہ نے میرے دلِ دردآگیں پر چھوڑے ورنہ جو کچھ دل میں ہے اُسے تو

دل داند و من دانم و داند دلِ من۔

پرویز

شملہ

یکم جون ۱۹۳۸ء

مرثیۂ اقبالؒ

الٰہی کیسی قیامت کی یہ سحر آئی
جو آج رحلتِ اقبال کی خبر آئی
وفاتِ شاعرِ مشرق کی اطلاع ملی
کہ رُوح و قلب میں برقِ بلا اُتر آئی
زمانہ ہو گیا آنکھوں میں ایسا تیرہ و تار
کہ زندگی میں جھلک موت کی نظر آئی

خدا کرے کہ غلط ہو یہی تھی خواہشِ دل
خبر اگرچہ نہایت ہی مُعتبر آئی
ھزار حیف دوا کوئی کارگر نہ ہوئی
دُعا فلک پہ گئی اور بے اثر آئی،
ہمارا گنجِ گرانمایہ اُس کے ہاتھ لگا
لُٹے جو ہم تو قضا کی مُراد بر آئی
سیاہ روز ہوئی آج ملتِ بیضا
کہ شامِ غم سے بھی اک تیرہ تر سحر آئی
امامِ فلسفہ و شاعری کا ماتم ہے
مہِ صفر بھی ہمارے لئے محرّم ہے

جو کائنات مُسخّر بھی ہو تو کیا حاصل؟
نہیں ہے موت پہ انساں کا اختیار افسوس
نہیں ہے ہستیٔ موہوم کا یقیں کچھ بھی
نہیں ہے عُمرِ دو روزہ کا اعتبار افسوس
روانہ ہو گیا ملّت کے باغِ ویراں سے
خزاں کے دور کا پیغمبرِ بہار افسوس
بھڑکنے پائی نہ اُس کی نوا سے آتشِ گل
کہ جل کے رہ گئی خود عندلیبِ زار افسوس
چمن میں ایک نئے دور کا کیا آغاز
اور آپ چل دیا، افسوس صد ہزار افسوس

ابھی نہ آیا تھا اُن گُلبنوں پہ رنگِ بہار
جنہیں وہ کرتا تھا اشکوں سے آبیار، افسوس
خود اپنی آنکھوں سے وہ فصلِ گُل نہ دیکھ سکا
تمام عُمر کیا جس کا انتظار، افسوس

جو بعدِ مرگ مِلا عیش کا پیام تو کیا
پس از اجل ہُوا محفل کا اہتمام تو کیا

کمی نہیں ہے زمانے میں رہنماؤں کی
مگر وہ راہنماؤں کا رہنما نہ رہا
زمانہ کانپتا تھا جس کی بے نیازی سے
وہ مردِ مومن و دردیشِ بے نوا نہ رہا

کھُلے نہ اُس کے مقامات اہلِ ظاہر پر
کہ انجمن میں وہ عارف قلندرانہ رہا

کرے گا اب دلِ یزداں بھی یہ کمی محسوس
کہ ایک "بندۂ گستاخ" لب کُشانہ رہا

تھا جس کا زمزمہ غالب نوائے فطرت پر
جہاں میں آج وہ شاعر غزل سرا نہ رہا

جہاں کو شعرِ دل آویز کے بہانے سے
سُنا رہا تھا جو پیغامِ آشنا، نہ رہا

بُجھا دل ایسا کہ اقبال کی وفات کے بعد
اسدؔ مرے لئے جینے میں کچھ مزا نہ رہا

ذرا بھی جی نہیں لگتا جہانِ فانی میں
خلا سا ہوتا ہے محسوس زندگانی میں

تجھے خُدا نے جو واپس بلا لیا اقبالؔ
ترے پیام کی تکمیل ہو گئی ہو گی

اب آسماں تری آمد کے منتظر ہوں گے
زمیں پہ تیری ضرورت نہیں رہی ہو گی

جہان اور جو آگے ہیں ان ستاروں سے
وہاں طلب ترے فکرِ بلند کی ہو گی

جو پڑ گئی ہے ضرورت تری نواؤں کی
فضائے خُلد کے نغموں میں کچھ کمی ہو گی،

ہم ایسی باتوں سے دل کو ہزار بہلائیں
مگر نہ دور طبیعت کی بے کلی ہوگی

مٹے گا داغ نہ دل سے تری جدائی کا
خلش نہ کم ترے دردِ فراق کی ہوگی

میں تجھ سے چند مہینے ہوئے کہ مل آیا
خبر نہ تھی یہ ملاقات آخری ہوگی

کہاں کرائے گی "جاوید منزل" اب تری دید
کہ تو نے جا کے بسالی ہے منزلِ جاوید

ترا مقام تو ہے شاعری سے بالاتر
ہے تیری ذات پہ البتہ شاعری کو ناز

ہ علامہ مرحوم کے دولتکدہ کا نام جوان کے فرزند محمد جاوید اقبال کے نام پر رکھا گیا۔

یہ شاعری ہے کہ شعر و سخن کے پردے میں
خودی کی جلوہ نمائی، خُدا سے راز و نیاز
دلوں کو دے جو نئی زندگی وہ درد و اثر
کرے جو رُوح کی نشو و نما وہ سوز و گداز
نگاہ جاتی ہوئی کائنات کے دل تک
سخن پہنچتا ہوا تا بہ سرحدِ اعجاز
بہت طویل زمانے کے بعد آیا تھا
فضائے ہند میں اک موجۂ نسیم حجاز
شمیم بیز، دل آویز اور جنوں انگیز
ولیک حیف! بہت تیز اور سبک پرواز

جو اس قدر سفرِ آخرت میں جلدی کی
تھا تیرے واسطے کارِ جہاں بس اتنا دراز؟

کسی کو اور کرانا تھا انتظار ابھی
کچھ اور دن اُسے رکھنا تھا بے قرار ابھی

یہ کیا قضا و قدر کی ستم ظریفی ہے
اسیرِ دامِ اجل شاعرِ حیات ہُوا
نہیں، اک اور جہاں کی تلاش میں شاید
رواں وہ طالبِ اسرارِ کائنات ہُوا
جو مطمئن نہ ہُوا جلوۂ صفات سے وُہ
تو رہ نورد بسُوئے حریمِ ذات ہُوا

حیات کے حرمِ پاک میں وہ اب بھی ہے
فنا کا بُت کدہ محرومِ التفات ہُوا
کہا "میں موت سے ڈرتا نہیں مسلماں ہوں"
بوقتِ نزع بھی ثابت ترا ثبات ہُوا
خوشی سے خُلد میں جا اے رسُول کے عاشق
یہ عشق تیرے لئے ضامنِ نجات ہُوا
ترے تو گوشۂ مرقد میں روشنی ہوگی
مگر ہمارے لئے آہ! دن بھی رات ہُوا
ہُوا جہاں میں یکایک یہ انقلاب افسوس
غروب ہو گیا مشرق کا آفتاب افسوس

بہت دنوں سے یہاں عارفانِ صاحبدل
نہ مسجدوں میں تھے باقی نہ خانقاہوں میں
جو تھے فقیر تو رہبانیت کے گوشہ نشیں
جو تھے امیر تو شاہوں کی بارگاہوں میں
ترے وجود نے اک بار کر دیا تازہ
زمانہ رومؔی و رازؔی کا پھر نگاہوں میں
کبھی جو تھی دلِ رومؔی سے عقلِ رازؔی سے
وہ روشنی نظر آئی تری نگاہوں میں
ترے کلام نے توڑا فرنگ کا وہ فسوں
سُراغِ زیست دکھاتا تھا جو گناہوں میں

کلیم دخانۂ فرعون کی مثال ہوئی
وہ تربیت تری مغرب کی درسگاہوں میں
صراطِ عشق پہ تونے لگا دیا اُن کو
بھٹک رہے تھے جو عقل و ہوس کی راہوں میں
یہ رمز ہے شعرا پر تری فضیلت کی
دلوں میں ہے تری عظمت بھی اور محبت بھی
وہ شعر و فلسفہ کا بحرِ بیکراں اقبال
جنونِ عشق و محبت کا رازداں اقبال
وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال
وہ شاعری میں حقیقت کا ترجماں اقبال

وہ جسمِ قوم ہیں مثلِ دماغ و دیدہ و دل
وہ رُوحِ فطرتِ اِسلام کی زباں اقبالؔ

یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات
وہ میرا مُرشد و اُستادِ مہرباں اقبالؔ

نہیں نہیں، کبھی اقبالؔ مر نہیں سکتا
سپردِ خاک ہُوا جو وہ ہے کہاں اقبالؔ

وہ کر رہا تھا کئی دن سے اس میں درپیدا
گیا نہ عاقبتؔ آں سُوئے آسماں اقبالؔ

دلوں میں تا بہ قیامت رہے گی یاد اُن کی
اگرچہ آج نگاہوں سے ہے نہاں اقبالؔ

جناں میں اُس کا قیام اور جہاں میں اُس کا کلام
دوگونہ ہو گئی حاصل اُسے بقائے دوام

نظر ہے کتنی ہی محدود و نارسا ان کی
جنہیں گُماں ہے کہ اقبالؔ سخت کوش نہ تھا

شعاعِ مہر کی صورت حیات پرور تھا
عجب نہیں جو بظاہر وہ گرم جوش نہ تھا

نسیمِ صبح کے مانند تھا وہ غنچہ کُشا
تباہ کاریٔ طوفانِ پُرخروش نہ تھا

اُسی کی مے کا اثر تھا بہ سب، اگرچہ وہ خود
شریکِ شورشِ رندانِ بادہ نوش نہ تھا

خریدنا اُسے چاہا جہاں نے بہتیرا
مگر وہ بندۂ آزاد خود فروش نہ تھا
تمام زندگی اُس کی تھی اک جہادِ عظیم
وہ گرچہ تیغ بدست و کفن بدوش نہ تھا
نگاہِ اہلِ محبّت میں تھا ولی اقبال
کمی جو تھی تو یہی تھی کہ خرقہ پوش نہ تھا

اگرچہ آج جہاں سے گذر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

وہ خود نہیں مگر اُس کا پیام باقی ہے
وہ چُپ ہُوا مگر اُس کا کلام باقی ہے

وہ آسمان کی طرف اُڑ گیا مگر اُس کا
زمینِ شعر پہ نقشِ دوام باقی ہے
اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے، وہ خُم، وہ صُراحی، وہ جام باقی ہے
جو رہ گئی ہے رگِ تاک میں وُہی نہ سہی
کھچی ہوئی تو مئے لالہ فام باقی ہے
وہ مردِ پاک نظر جس کی طرح ڈال گیا
ابھی وہ کام بہت ناتمام باقی ہے
وہ جس نظام کی رکھتا تھا آرزو دل میں
بہت کچھ اُس کا ابھی انتظام باقی ہے

اگرچہ صدمہ ہے صبر و ثبات سے بڑھ کر
سنبھالو ہوش کہ دنیا میں کام باقی ہے

کہیں نہ جوشِ عمل سیلِ اشک میں بہہ جائے
جو بات کہہ گیا اقبالؔ وہ یونہی رہ جائے

اٹھو مقابلۂ گردشِ زمانہ کریں
حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں

فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقینِ بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں

عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی
ہمارے توسنِ ہمّت کو تازیانہ کریں

اسی سے ملّت خوابیدہ جاگ اُٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبالؔ کا ترانہ کریں

نہ مِل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی
اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں

جمالِ یار تو بیتابِ خود نمائی ہے
پر اہلِ دل بھی تو پیدا کوئی بہانہ کریں

اسی لئے ہوا اسدؔ رفعتِ حبیب کی طلب
کہ سجدہ کر کے بلند اُن کا آستانہ کریں

یہی ہے حضرتِ اقبالؔ کا پیامِ حیات
اسی پیام سے حاصل کریں دوامِ حیات

غمِ اقبالؒ

دیدۂ اشکبار کو اور نہ اشکبار کر
ملّتِ غم رسیدہ اب صبر بھی اختیار کر

پھول کی آنکھ بھی ہے تر، چشمِ ستارہ بھی ہے نم
شاہدِ کائنات کو اور نہ سوگوار کر

کوند کے موجِ اشک میں ڈوب، جلائے برقِ غم
شعلۂ مستقل بنا دل میں اسے اُتار کر

ماتمِ عارضی کا رُخ جانبِ عشق پھیر دے
سوزِ غمِ فراق سے درد کو پائدار کر

جو کہ رموزِ سروری تجھ کو بتا کے چل دیا
ویسے فقیر کے لئے صدیوں اب انتظار کر

پردۂ مرگ نے اُسے تجھ سے چھپا لیا تو کیا
اپنی حیاتِ عشق میں تو اُسے آشکار کر

ہے یہی ماحصل اسدؔ اُس کے پیامِ خاص کا
عشق سے زندہ کر خودی، فقر سے اُستوار کر

اقبالؔ

(یہ نظم لاہور میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو "یوم اقبال" کے جلسے میں پڑھی گئی تھی)

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبالؔ کا
کیونکہ ہم آہنگِ قرآں ہے کلام اقبالؔ کا

ذہنِ ہندی، علمِ افرنگی، نگاہِ یثربی
ہے محیطِ مشرق و مغرب نظام اقبالؔ کا

بڑھ گیا رازیؔ سے اور پھر رازدارِ دیں بھی ہے
کیوں نہ ہو° رومیؔ ہی جب پیرِ امام اقبالؔ کا

جو وظیفہ دیدہ و دل کا ہے جسمِ فرد میں
ہے وہی کچھ پیکرِ ملّت میں کام اقبالؔ کا

عصرِ لادینی میں رکھا رایتِ دیں کو بلند
کیوں نہ چمکے مثلِ مہر و ماہ نام اقبالؔ کا

تیرے دل کو، تیری نظروں کو بدل کر رکھ دیا
کیا ترے نزدیک کچھ کم ہے یہ کام اقبالؔ کا

یہ جو ملّت میں نظر آتے ہیں آثارِ حیات
ان میں بھی ہے کارفرما فیضِ عام اقبالؔ کا

° مولانائے رومؔ کا مشہور شعر ہے: ؎ گر بہ استدلال کارِ دیں بُدے ۔ فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے۔

اُمّتِ مرحوم کو دے کر سُراغِ زندگی
کر گیا کارِ مسیحائی پیامِ اقبالؔ کا

شعلہ در آغوش ہیں غنچے ریاضِ قوم کے
ہو رہا ہے جلوہ گر سوزِ تمامِ اقبالؔ کا

جاگ اُٹھا اس کی نوا سے سبزۂ بیگانہ بھی
گوشِ گُل ہی تک نہیں پہنچا پیامِ اقبالؔ کا

خاکیوں میں کر دیا ہے تازہ پھر عشقِ رسولؐ
قُدسیوں کے دل میں بھی ہے احترامِ اقبالؔ کا

آستانِ مصطفےٰؐ پر سجدۂ فکرِ بلند
ہے زبانِ اہلِ معنی میں کلامِ اقبالؔ کا

اے اسدؔ محفل سہی کوتاہ دست و کم طلب
تُندئ صہبا سے ہے گردش میں جامِ اقبالؔ کا

قیمت ۴ر آنے

ملنے کا پتہ

دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر

مطبع شمس ملتان شہر میں محمد اکرم خاں پرنٹر و پبلشر نے
چھپوا کر دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر سے شائع کیا